Volume 02, Issue 03,
October-December 2024
PP: 205-211
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

عرفان جاوید کی کتاب "آدمی" میں تاریخی شعور

Historical Consciousness in Irfān Jāvēd's Book "Ādmī"

Arslan Ahmad
arslanmalik1610130@gmail.com
Research Scholar, MPhil Urdu, Islamia University Bahawalpur.

Article History

Received
05-12-2024

Accepted
25-12-2024

Published
29-12-2024

Abstract & Indexing

Abstract

Throughout human history, two fundamental principles have governed the course of life: change and stagnation. In the domain of literature, change holds particular importance as it fosters growth, diversity, and relevance, while stagnation leads to the decline and rigidity of literary traditions. Urdu literature, like other literary traditions, has witnessed significant evolution, with many writers playing a pivotal role in embracing change through historical consciousness. Historical awareness not only enriches literary narratives but also allows writers to connect the past with contemporary realities, offering deeper insights into human experiences. Among contemporary Urdu writers, Irfān Jāvēd has emerged as a distinctive voice, integrating historical consciousness into his creative works. His sketches reflect a profound understanding of history, enabling him to highlight societal, cultural, and psychological dimensions with remarkable depth. In his celebrated book Ādmī, Jāvēd masterfully employs historical consciousness to delve into the complexities of human nature and the interplay of past and present. The narratives in Ādmī are not merely literary pieces but also reflections of historical transitions and their impact on individual and collective identities.

This study examines the significance of historical consciousness in Irfān Jāvēd's works, focusing on how his innovative approach has contributed to the evolution of Urdu literature. By analyzing Ādmī, this research aims to highlight the importance of historical awareness in fostering literary dynamism and its role in preventing stagnation within literary traditions. Irfān Jāvēd's contributions underscore the enduring relevance of history as a source of inspiration for contemporary literary creativity.

Keywords

Historical Consciousness, Irfān Jāvēd, Ādmī, Urdu Literature, Literary Evolution, Societal Reflection, Historical Transitions, Creative Writing.

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

OPEN ACCESS

زیست کے دو ہی قاعدے رہے ہیں جن میں ایک قاعدہ ثبات کا ہے جب کہ دوسرا اصول تبدُل کا یا اصول تغیر کا رہا ہے۔ ہمیشہ سے حرکت اور تغیر دونوں ایک ہی چیز کے دو مختلف نام رہے ہیں۔ تغیر پذیری کا تعلق تاریخ سے ہے۔ کیوں کہ تغیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ چیزوں کے بگڑنے اور سلجھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس طرح تغیر یا حرکت کا تعلق تاریخ سے جوڑا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف جو چیز ایک مقام پر آکر جمود کا شکار ہوگئی اس کو تاریخ میں شامل نہیں کیا جاتا۔ ٹھیک اِسی طرح جب ہم ادب کی زبان میں تاریخی شعور کی بابت بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کسی منجمد یا جمودی ادب کی بات نہیں ہوتی بلکہ اس میں تغیر پذیر ادب کے متعلق بات کی جاتی ہے۔ ادب میں جن چیزوں کو اہمیت حاصل ہے، ان میں ایک ہئیت اور دوسرا اس فن پارے سے متعلق مواد سے۔ مواد دراصل کسی بھی تخلیق کار کے وسیع مطالعے اور مشاہدے سے جنم لیتا ہے۔ یہ مواد متخیلی بھی ہو سکتا ہے اور اس میں حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود اس میں تاریخی عنصر نمایاں رہتا ہے۔

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ تاریخی شعور کا زیادہ تر انحصار مواد پر ہوتا ہے۔ ہم تاریخی شعور میں ہمیشہ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارا ماضی کیسا تھا؟ یا ہمارے ماضی کا ادب کس نوعیت کا تھا؟ تاریخی شعور میں ہمیشہ تین لمحات کو فوقیت دی جاتی ہے۔ ایک لمحہ جو ماضی کا حصہ تھا، دوسرا ہمارے حال اور آج کا لمحہ جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تیسرا آنے والے کل کا وہ لمحہ جو مستقبل میں آئے گا۔ اجتماعی طور پر ہمیں یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ آیا ہمارا گزرا ہوا کل کیسا تھا اور موجود سے ہوتے ہوئے آنے والا کل کیسا ہو سکتا ہے۔

تاریخی شعور دراصل یہ جاننے کا عمل ہے کہ ہمارے معاشرے اور سماج میں ہونی والی تبدیلیوں کا یہ انوکھا سفر کن منازل سے ہوتا ہوا ہمارے موجود تک پہنچا اور اس وقت ہم اس تبدیلی سے گزر کر کہاں پر موجود ہیں۔ ڈاکٹر سجاد نعیم لکھتے ہیں:

> ”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ جس سے اس کے اندر تاریخی اور تہذیبی شعور زندہ رہتا ہے۔ وہ مختلف محرکات کا جائزہ لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا تاریخی شعور بدلتا ہے۔“[1]

اردو زبان و ادب میں خاکہ نگاری ایک ایسی صنف کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے جس میں کسی فرد کی شخصیت کو اختصار لیکن جامع انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ جب ایک خاکہ نگار کسی شخصیت کو بیان کرتا ہے تو لا محالہ اس شخص کے عہد کو بھی موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی شخصیت کو اس کے عہد سے باہر نکال کر اچھے سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ممدوح کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے بعض اوقات تاریخی اور تہذیبی عوامل اس کردار کے ساتھ خاکے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ خاکہ نگاری کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ خافی خان اور مرزا فرحت اللہ بیگ کا لگایا ہوا چھوٹا سا پودا آج ایک گھنا ور گہرا درخت بن چکا ہے۔ جس کی جڑیں گہرائیوں میں سے ہوتی ہوئی اس درخت کو مزید مضبوطی عطا کر رہی ہیں۔

اکیسویں صدی میں خاکہ نگاری کی روایت کا ایک اہم اور بڑا نام عرفان جاوید بھی ہے۔ ان کے تین (۳) خاکوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ”دروازے“ (۲۰۱۷ء)، ”سرخاب“ (۲۰۱۸ء)، اور ”آدمی“ (۲۰۲۳ء) شامل ہیں۔ عرفان جاوید کا نام، خاکہ نگاری میں جدید عہد کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کے خاکوں کی انفرادیت یہ ہے کہ اِنھوں نے اپنے خاکوں میں موضوع شخصیت کو ہی اچھے سے بیان نہیں کیا بلکہ اس شخصیت سے جڑے تمام واقعات اس عہد کے تناظر میں بڑی مہارت سے بیان کرتے ہیں۔

عرفان جاوید اپنے خاکوں میں تاریخی حوالے بھی دیتے ہیں۔ جن کا تعلق شعوری یا لاشعوری طور پر اس فرد کی شخصیت کا پرتو بن جاتا ہے۔ انھوں سے روایت سے ہٹ کر اپنے خاکے لکھے اور تاریخی عناصر کو بھی اپنے خاکوں کا حصہ بنایا۔ بلاشبہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے جس کی جھلک ہمیں ان کے خاکوں میں جابجا نظر آتی ہے۔

"عرفان صاحب خوب لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ یاد رہتے ہیں اپنی تہذیب کی وجہ سے اور کچھ تہذیبیں اور تمدن یاد رہ جاتی ہیں کچھ لوگوں کی وجہ سے! اس باب میں پوری کی پوری تہذیب زندہ ہو جاتی ہے عرفان صاحب کے بیان سے۔۔۔۔ نہ لوگ رکتے ہیں، نہ وقت رکتا ہے نہ تہذیبیں، نہ تمدن۔ تغیر لازمی ہے"۔[2]

عرفان جاوید کے خاکوں کا تیسرا مجموعہ "آدمی" کے نام سے ہے۔ اس مجموعے میں ۶ خاکے موجود ہیں۔ اس کتاب کا پہلا خاکہ آصف فرخی کا 'نیا، پرانا آدمی" کے نام سے ہے۔ جب کہ دوسرے خاکوں میں، من موجی (اسحاق نور)، گبرئیل، خواب دیکھنے اور دکھانے والا (مطیع الرحمان)، بڑی ماموں، بانسری بابا کے عنوان سے ہیں۔ اس خاکوں کے مجموعے میں عرفان جاوید کا تاریخی شعور بہت نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کے لکھے خاکوں کی ایک خوبی بہت نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے خاکوں میں صرف موضوع شخصیت کو ہی بیان نہیں کرتے بلکہ اس سے جڑی تمام چیزوں جیسے تاریخ، تہذیب اور معاشرت کو بھی اپنے خاص اسلوب میں قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہی وصف انھیں خاکہ نگاری کی روایت میں اہم مقام دلاتی ہے۔

عرفان جاوید اپنے خاکوں میں تاریخی چیزوں اور حوالوں کو بہت اچھے سے بیان کرتے ہیں۔ یہاں ہمارا مقصد اس بحث میں پڑنے کا قطعاً نہیں ہے کہ ان کے خاکوں میں بیان کردہ تاریخی حقائق کس حد تک درست ہیں۔ کیوں کہ یہ بحث خاصی طویل ہو جانی ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں تاریخی حوادث اور معلومات کو جس طرح برتا اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ ترکی کی بات ہو اور آیا صوفیا کا ذکر نہ ہو شاید یہ ممکن نہیں۔ عرفان جاید نے اس عمارت کی تاریخ کو اپنے اسلوب میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"آیا صوفیا نو سو برس تک دنیا کا سب سے بڑا گرجا گھر رہا تاوقتیکہ 1520ء میں سیوائل چرچ اسپین میں تعمیر نہ ہو گیا۔ 1453ء تک چرچ رہنے کے بعد اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ کمال اتاترک پاشا کے سیکولر نظام کے تحت 1953ء میں اسے عجائب گھر کی شکل دے دی گئی۔"[3]

فن تعمیر کی حامل یہ عمارت ۵۳۷ء میں رومی شہنشاہ جنیسٹن اول نے تعمیر کروائی تھی جو بعد ازاں سلطان فاتح محمد کی قسطنطنیہ پر چڑھائی کے بعد اس عمارت کو مسجد کا درجہ دے دیا گیا۔ کمال اتاترک جب ترکیہ کا سربراہ بنا تو اس نے مسجد میں نماز پر پابندی لگا کر اس کو عجائب خانہ کی شکل دے دی۔ لیکن نوجوانوں کی تحریک کے سبب ترکیہ کے صدر طیب اردگان نے ۲۰۲۰ء میں اس کو دوبارہ مسجد کی صورت بحال کر دیا۔ اِس عمارت کی تاریخی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔ عرفان جاوید جیسے صاحب مطالعہ کی نظر سے اس کی تاریخ کیسے چھپ سکتی تھی۔ انھوں نے اس تاریخی عمارت کی مکمل تفصیل کو اپنے خاکے کا حصہ بنایا۔ جس سے ان کے تاریخی شعور کو داد دینا بنتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ٹیولپ پھولوں کا سب سے بڑا شہر ہالینڈ ہے اور اس کو ہی تاریخ تصور کر لیا گیا۔ لیکن اگر تاریخ کے کچھ اوراق ہم ماضی قدیم میں کھولتے ہیں تو ہم یقیناً حیران ہو جائیں گے کہ ہالینڈ سے پہلے ان پھولوں کا مسکن ترکی ہی تھا۔ اس تاریخی پہلو کو عرفان جاوید نے اپنے خاکے میں کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ استنبول ہی تھا جہاں ایک فلینڈری (فلیمش) سفارت کار نے سلیمان عالی شان کے دربار میں حاضری دی اور واپس جاتے ہوئے یہاں سے ایک پھول لیتا گیا جس سے یورپ ناواقف تھا۔ یہ ٹیولپ کا پھول تھا جو سولھویں صدی میں ہالینڈ میں متعارف ہوا اور آج اس ملک کی پہچان ہے۔"[4]

آج کے جدید ہالینڈ میں ٹیولپ یا گل لالہ کو مقامی پھول کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس کو پہلی بار ویانا کے شہنشاہ میزیناڈ کا سفارت کار استنبول شہر سے یورپ لایا تھا اور وہاں سے سفر کرتا ہوا یہ ہالینڈ پہنچ گیا۔ اس عالمی حوالے کو بڑی چابک دستی نے عرفان جاوید نے اپنے خاکے حصہ بنایا ہے۔ ان کے خاکوں میں جو ہمیں تاریخی شعور نظر آتا ہے وہ ان کی فکر کی آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر خاکوں میں ہمیں یہ تاریخی چھاپ جابجا نظر آتی ہے۔

یہاں پر اس خاکے میں عرفان جاوید ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب زرعی انقلاب آیا تو اس کے ذریعے بہت سی مشکلات آسان ہوتی گئی۔ زراعت میں انقلاب پیدا ہو گیا جس نے مستقبل کے لیے اپنی راہیں استوار کی۔ تاریخ میں زراعت کی بابت انقلاب کو وہ کچھ اپنے انداز میں اس طرح بتاتے ہیں:

> ”یہ ترکی ہی تھا جہاں گیارہ ہزار برس قبل گندم اور جو کی باقاعدہ کاشت کی جاتی تھی اور یہیں ہی سے دنیا میں زراعت کا آغاز ہوا اور یہ ترکی ہی تھا جس نے نوے کی دہائی میں یہ خیال باطل کر دیا تھا کہ انسانی آبادیاں زرعی انقلاب کے بعد وجود میں آئیں۔ جنوبی ترکی میں پائے جائے گئے آثارِ قدیمہ کے مطابق دنیا کی قدیم ترین کلاں سنگی دریافتوں سے سامنے آیا ہے کہ انسان نے زرعی انقلاب سے دو ہزار برس قبل ہی آبادیاں بسانی شروع کر دی تھیں۔“[5]

جب ایک تخلیق کار تاریخ کے واقعات کو اپنے شعور، نفسیات اور اپنے تاثریاسیات میں جگہ دیتے ہوئے ادب کا حصہ بناتا ہے تو ادیب کی تخلیقی مزاج کو ایک رستہ مل جاتا ہے۔ وہ اس راستے پر چلتے ہوئے سماجی، سیاسی اور عمرانی نظریات سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے اور اُس ادیب کا مختلف زمانوں کی تاریخ سے ایک قسم کا ربط سا بن جاتا ہے:

> ”وہ تہذیب جو تغیر سے نا آشنا ہو۔ تاریخ سے بھی نا آشنا رہتی ہے۔ مگر تاریخ صرف واقعات کا ڈھیر نہیں بلکہ ان کے پیچھے ایک ایسے تناظر کا ہونا بھی لازمی ہے جس کی نسبت سے ان کی پہچان ہو سکے۔ وقت کی گزران کا احساس، تاریخی شعور کی اہم ترین شرط ہے۔“[6]

عرفان جاوید کا تعلق سول سروسز سے ہے۔ اتنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مطالعہ کرنا نہیں چھوڑا۔ وہ کسی بھی چیز کو منطقی نتائج سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو عقلی دلائل سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے خاکوں میں جب بھی کسی تاریخی واقعے کو بیان کرتے ہیں تو اس کے ٹھوس دلائل بھی ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ قاری کے سامنے کوئی مبہم تصویر پیش نہیں کرتے بلکہ اس تصویر کو ملاوٹ اور ابہام سے پاک کر کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ہندو مذہب میں آواگون کے نظریے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندو مذہب کے نزدیک روح اپنے اعمال کے سبب دوسرا جنم یا قالب بدل لیتی ہے۔ اگر کوئی روح نیک کام کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئی تو وہ اگلے جنم میں اچھے قالب میں سرایت کر جائے گی اور اگر اس کے اعمال بد ہوئے تو اس کا قالب بھی ویسا ہی ہو گا۔ ہندو اس نظریے پر اتنا ہی یقین رکھتے ہیں جتنا کہ مسلمان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ عرفان جاوید نے اس نظریے کو اپنے خاکے میں جگہ دی۔ جس سے ان کے تاریخی شعور کو مزید تقویت ملتی ہے:

> ”ہندو علوم کے مطابق گزشتہ جنم کے یاد رہنے کی نشانیاں دائیں ہاتھ سے کام والے کے بائیں ہاتھ میں اور بالعکس ہوتی ہیں۔ آواگون پر بہت سے اہم غیر ہندو دانش ور، سائنس داں اور حکم راں یقین رکھتے ہیں جن میں فرانسیسی جرنیل اور حکم ران نپولن، جرمن شاعر و فلسفی گوئٹے، رجحان ساز

مصور سالوا نے ڈورڈالی، روسی ناول نگار لیوٹا ٹالسٹائی، فلسفی نطشے اور امریکی صنعت کار ہنری فورڈ وغیرہ شامل رہے ہیں۔"[7]

عرفان جاوید کی حساسیت صرف اس بات تک محدود نہیں رہتی وہ اُس تاریخی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے مختلف مثالیں بھی دیتا ہے۔ اس نظریے سے متعلق مصنف نے اچھی خاصی بحث کی ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں بھی اس کی مثالیں دی ہیں۔ مثال کے طور پر شانتی دیوی جو کہ 1926ء میں دلی میں پیدا ہوئی تھی۔ جب وہ کچھ سالوں کی ہوئی تو اس نے اصرار کیا کہ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے پاس جانا چاہتی ہے۔ حالانکہ اس کی عمر بمشکل چار پانچ سال ہی ہو گی۔ جو تفصیلات اس بچی نے بتائی وہ حقیقت پر مبنی تھی۔ دوسری مثال انھوں نے لاما ذیزہنگ کا بتایا جو کہ ۱۹۸۷ء کو نیپال میں وفات پا چکا تھا۔ لیکن امریکا میں سونم ونگڈو کی صورت وہ دوسرا جنم لیتا ہے۔ اس طرح کی تین چار مزید مثالیں بھی عرفان جاوید اپنے خاکوں میں دیتے ہیں۔ تاریخ دراصل اس دنیا میں رہنے والے انسانوں کی سوچ، فکر اور انسانی برتاؤ کا ایک وسیلہ یا اظہار ہوتا ہے۔ اور عرفان جاوید نے ان تمام عوامل کو اپنے خاکوں میں برتا ہے۔ وہ انسانی وجود سے جڑے تاریخی نظریات اور فکریات کو بھی اپنے خاص انداز میں مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں جس کی مثال اوپر آواگون کی صورت دی گئی ہے۔

کتاب "آدمی" میں موجود ایک خاکہ من موجی کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ یہ خاکہ دراصل مشہور ماہرِ نجوم اسحاق نور کا ہے۔ اس خاکے میں مصنف نے علم نجوم کے متعلق تاریخی حوالے سے دیتے ہیں:

"اسحاق نور ویدک آسٹرالوجی کے ماننے والے تھے۔ یہ پانچ ہزار پہلے بابل ونینوا سے شروع ہو کر مصر سے ہوتی ہوئی ہندوستان میں داخل ہوئی تھی۔۔۔۔ اس کی عمارت معلوم سیاروں، ستاروں کے اوپر کھڑی ہے۔"[8]

ویدک آسٹرالوجی کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ جو کہ عام تاثر ہے کہ یہ ویدوں سے متعلق ہے۔ جس میں نو سیاروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس علم میں ان نو سیاروں کی منتقلی کو مستقبل کے متعلق پیش گوئی کی جاتی ہے۔ لیکن خاکہ نگار نے اس علم کو مصر کی بابل ونینوا کی تہذیب میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں سے پھر یہ علم مصر منتقل ہوا اور مزید آگے یہ ہندوستان کی سرزمین پر پہنچ گیا۔ وہ قدیم علم وفنون کو نئے زمانے کی گرد میں تلاش کرتے ہیں۔ اور جب اس علم وفن کا کوئی سرا ان کے ہاتھ لگتا ہے تو وہ اس کو اپنے خاکے کی زینت بنانے میں دیر نہیں لگاتے۔ وہ اس تاریخی پہلو کی گہرائیوں میں جا کر اس کو اجاگر کرتے ہیں۔

ہندوستان جو کہ ماضی قریب میں ایک مشترکہ تہذیب کا علمبردار تھا۔ اس تہذیب میں رہنے والے ہر فرد پر تہذیب و معاشرت کے اصول لاگو ہوتے تھے۔ لیکن وقت نے ان تہذیبوں کو تقسیم کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس عہد میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کے آثار آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ آثار مثبت بھی ہیں لیکن چند ایک منفی نوعیت کے بھی ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔

"قیام پاکستان سے پہلے ہیرا منڈی لاہور، جسے ہیرا سنگھ کے نام پر آباد کیا گیا تھا، برصغیر میں کلکتہ، بنگلور، لکھنؤ اور بمبئی کے بعد چوتھا بڑا بازار حسن تھا۔ تقسیمِ ہند کے وقت یہاں سے کتنی طوائفیں کیسے اور کن حالات میں ہندوستان چلی گئی اور کون سی کیسے یہاں آن بسیں، ایک دلچسپ موضوع ہو سکتا ہے۔"[9]

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پنجاب پر حکومت کے دوران اس کے دیوان خاص کے نام ہیرا سنگھ کی مناسبت سے ایک بازار بنایا گیا۔ جو کہ بعد میں ہیرا منڈی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس بازار کے تاریخی نام پر عرفان جاوید نے اچھی خاصی معلومات دی ہے۔ جو کہ ان کی تاریخ میں دلچسپی کو عیاں کرتی ہے۔

اگر ہم ماضی میں موجود چیزوں کو تاریخ کے معنوں میں دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی کی چیزیں دراصل ہمیں کچھ چیزوں کی صورت مستقبل کی تعمیر کے متعلق آگاہ کر رہی ہوتی ہے۔ اور یہی چیز ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک پُل کا سا کام کرتی ہے۔ ہمارا ماضی ہمیشہ سفر کی حالت میں رہتا ہے اور اس کی روانی اور اس ماضی کا رخ مستقبل کی طرف ہوتا ہے۔ یہی سفر ہمیں ہمارے مستقبل سے روشناس کراتا ہے۔ عرفان جاوید کے خاکوں میں بھی اس روانی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ ماضی کی تاریخ کو مستقبل کے ساتھ اِس طرح جوڑ دیتے ہیں جیسے کہ وہ ماضی، ہمارا ماضی نہیں رہتا بلکہ اس میں ہمیں اپنے مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں تاریخی شعور کو بہت اچھے سے برتا ہے جس کی مثال شاید آج کے زمانے میں نظر نہیں آتی۔

آدمی میں شامل ایک خاکہ بڑی ماموں کے نام سے شامل ہے۔ یہ خاکہ دراصل عرفان جاوید کے ایک دوست کے ماموں کا ہے۔ اس خاکے میں امریکہ کی مختلف ریاستوں کی بابت بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جس سے ان کا شعور مزید نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے امریکی ریاست نیواڈا کے شہر لاس ویگاس کی بابت لکھتے ہیں:

> "لاس ویگاس جو ابتدائی طور پر تعمیراتی کارکنوں کے لیے آباد کیا گیا تھا، ۱۹۳۱ء میں نیواڈا ریاست کی جانب سے جوئے کو قانونی شکل دیے جانے کے بعد، مافیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔"[10]

اس اقتباس میں ریاستی تدابیر اور اس سے متعلقہ قوانین کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا ایک کام کیا گیا ہے۔ اس شہر کو بنانے میں جو افعال کار فرما تھے ان کو ماضی میں شاندار قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن مستقبل کی بابت بات کی جائے تو اس میں بہت سے عوامل ایسے شامل ہو گئے ہیں جو کہ عام انسانی زندگی و فلاح سے متعلق بالکل بھی نہیں ہے۔ مصنف نے ان دو عوامل کو بڑی چابک دستی سے اپنے خاکے کا حصہ بنا کر قاری کو اس کے متعلق بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے ماضی میں کون سی چیزیں موجود تھیں اور اب حال میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ نیز مصنف نے مختلف سماجی قدروں اور تہذیبی عوامل کو بھی اس خاکے میں بتانے کی ایک سعی کی ہے۔ ماضی کا نظام کس طرح آنے والے نظام کے پس منظر کو بیان کرتا ہے اس کی عکاسی بھی ہمیں اس اقتباس میں نظر آتی ہے۔ مختلف اوقات میں تغیر پذیر چیزوں اور ان سے منسلک رد عمل کو بھی بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے جن سے ان کا تاریخی شعور ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

اگر عرفان جاوید کے خاکوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان کے خاکوں میں تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی حقائق کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ان کے خاکوں میں وقت اور تاریخی شعور دونوں کار فرما ہیں۔ یہی چیز ان کے خاکوں کو ودیعت کرتی ہے۔ نیز ماضی کے ذہنی رویوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عوامل کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مختلف تحریکوں کی بابت جو رد عمل ماضی میں پیش ہوا اور اس کا اثر ہمارے مستقبل پر پڑا ان کو بھی بڑی مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ سب چیزیں مل کر مصنف کی ذہنی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان کے تاریخی شعور کو بھی بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں تاریخی شعور کو استعمال کرتے ہوئے متوازن اور مثبت طریقے سے معروض کو بیان کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1 سجاد نعیم ڈاکٹر، **"اردو ناول میں تاریخی اور تہذیبی شعور"**، جہان تحقیق، شمارہ4، جلد2(2021ء)، ص336۔

2 سمپورن سنگھ گلزار، فلیپ، **دروازے**، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2017ء)۔

3 عرفان جاوید، **آدمی**، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2023ء)، ص110۔

4 ایضاً، ص117۔

5 ایضاً، ص117۔

6 وزیر آغا، ڈاکٹر، **تخلیقی عمل**، (لاہور: مجلس ترقی اردو، 2010ء) ص85۔

7 عرفان جاوید، **آدمی**، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2023ء)، ص183۔

8 ایضاً، ص86۔

9 ایضاً، ص70۔

10 ایضاً، 216۔